ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کے نظریہ اسلامیت علوم کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ

Research and Critical Review of Dr. Najaullah Siddiqui,s theory of Islamic Sciences

Hafiz Fazl-e-Haq Haqqani
Lecturer department of Islamic Studies
University of Sawat
fazlehaq498@gmail.com

Ahmed Abdur Rehman
Lecturer department of Islamic Studies
Allama Iqbal Open University Islamabad

Abstract

Islamization of knowledge is one of the contemporary issues that attracted the minds of Muslim thinkers. It is started in late 20th century in the reaction of modern sciences and social sciences discoveries. These modern developments in sciences based upon the secularism theory, that deny the authenticity of revelation as the highest source of knowledge. On the other hand, Almighty Allah has created man as his successor and gave him superiority to angels on the basis of knowledge. God has made no difference among worldly and religiously knowledge. The both types of knowledge are mandatory for Khalifa. Muslim ummah ignored the advancement in worldly sciences after its declination in 18th century while the scientists have totally denied the biblical teachings as they were contradicting to science and technologies, so they delt with Islamic teaching like the biblical one. So, the Muslim thinkers realized the importance of the issue and tried to differentiate between the biblical and qur'anic teachings. As Islamic teachings are pure enough and haven't been mixed up with human beings' views. That's why

all new scientific developments verify and support the Islamic teaching accordingly.

Keywords: Muslim thinkers, Islamization of knowledge, 20th century, scientific research, revelation.

اسلامیت علوم: ایک تعارف

مغربی ممالک کی اکثر آبادی قدیم زمانے سے الہامی مذاہب عیسائیت اور یہودیت سے وابستہ رہی ہے۔ اہل کتاب کی سرشت میں دھوکہ بازی، مکاری اور حق سے روگردانی پائی جاتی ہے۔ اگر ہم موسی علیہ السلام اور ان کے بعد عیسی علیہ السلام کے ساتھ ان کی امتوں کے برتاؤ کا جائزہ لیں تو یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے۔ کہ انہوں نے ہمیشہ دجل و فریب، دھوکہ دہی و مکاری، کام چوری و بزدلی سے کام لیا ہے۔ قرآن کریم اس پر شاہد عدل ہے۔ جیسے کہ ارشاد باری ہے۔فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ[1]۔ چنانچہ ان کی ہلاکت کے دیگر اسباب میں سے ایک سبب اللہ پاک کے احکامات میں تحریف و تبدیلی اور بظاہر مشکل آیات کو من پسند اقوال میں تبدیل کرنا، مشکل آیات کو چھپانا، ان کی من پسند تعبیر و تشریح کرنا، ان کا وطیرہ رہا ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے وَإِنَّ فَرِيقًا مِنهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يعْلَمُونَ[2] ۔

جس وقت عیسائیت روم میں داخل ہو کر قدم جما رہی تھی، اس وقت اس پر انسانی خیالات کا گہرا چھاپ پڑ چکا تھا۔ آیات الہی پر اگندہ انسانی خیالات کی وجہ سے دھندلا چکی تھی۔ چونکہ نسل در نسل یہ تبدیلیاں چلی آرہی تھیں اسلئے کسی میں یہ اخلاقی جرات و ہمت نہیں تھی کہ اس کو چیلنج کر سکے۔ مزید ظلم یہ ہوا کہ جو پادری و پوپ اس تبدیلی و تحریف سے واقف تھے، انہوں نے بھی اپنی بالادستی اور اجارہ داری کو برقرار رکھنے کیلئے۔ جو ہے، اور جیسے ہے۔ کی بنیاد پر چلنے میں عافیت سمجھی۔ جب اٹھارویں صدی عیسوی میں یورپ کے اندر سائنسی علوم کا ڈنکا بجنے لگے اور تجربہ و مشاہدہ کی بنیاد پر علوم کو سمجھا جانے لگا تو وہ بائبل کی ان عبارات سے ٹکرانے لگے جو عیسائیوں کا ذہنی اختراع اور خواہشات کی عکاسی کر رہے تھے۔ چنانچہ عیسائی پادریوں کو بہت بڑا چیلنج پیش آیا۔ اب دو ہی صورتیں تھیں۔ یا تو وہ

بائبل کو غلط قرار دیتے اور سائنسی ایجادات کو تسلیم کرتے یا پھر سائنسی ایجادات کا انکار کرتے ہوئے بائبل کی بالادستی کو برقرار رکھتے۔ اگر پہلی صورت اختیار کرتے تو لا محالہ وحی میں نقص لازم آتا گو کہ یہ حقیقی وحی نہیں تھی۔ کیونکہ اس کی سائنس کے ساتھ کوئی چپقلش نہیں تھی۔ بلکہ یہ ان کی طرف سے داخل کردہ چیزیں تھیں۔ اور لازمی بات ہے کہ ایک انسانی ذہن کی محدود سوچ اور وہ بھی خالص اس کی من پسند رائے پر مشتمل ہو، کے اندر اتنی جامعیت ہو ہی نہیں سکتی کہ وہ آئندہ عالم موجودات میں پیش آنے والے ایجادات سے ہم آہنگ ہو سکے۔ لہذا انہوں نے مؤخر الذکر صورت کو اپنایا۔ اور ان تمام سائنسی علوم کا انکار کیا جو بائبل سے متصادم تھے۔ چونکہ ہر عمل کا لازمی رد عمل ہوا کرتا ہے۔ اسلئے جدید علوم کے علمبردار تمام سائنسدان بائبل کی تقدیس اور بالادستی کا انکار کرنے لگے۔ اور بتدریج وہ وحی کا بالکلیہ انکار کرتے ہوئے۔ کفر و انکار۔ کی سرحدات پر پہنچے۔ یوں پہلی دفعہ علوم وحی اور سائنسی علوم کے درمیان ایک خلیج پیدا ہوئی۔ قدرتی اور مشاہداتی بات ہے کہ جب کسی چیز کے متعلق شک اور شبہہ کا دروازہ ایک دفعہ کھل جائے تو وہ پھر مزید کھلتا جاتا ہے اور کسی بھی صورت وہ خلیج کم نہیں ہو پاتی۔ چنانچہ اس تقسیم کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ جوں جوں ایجادات میں اضافہ ہوتا چلا گیا توں توں وحی پر اعتماد اٹھتا رہا۔ چنانچہ وحی اور کائناتی علم ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے ہو گئے۔ چونکہ بد قسمتی سے اٹھارویں صدی عیسوی اور مابعد کی بیشتر ایجادات مغرب میں ہوئیں اسلئے ان سائنسدانوں نے وہی رویہ اور سوچ قرآن کریم کے متعلق بھی اپنایا۔ انہوں نے بائبل پر قیاس کرتے ہوئے قرآنی وحی اور غیر قرآنی وحی (حدیث) کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھا۔ اور ان تمام مغیبات کا انکار کر دیا جو تجربہ اور مشاہدہ سے ماوراء تھے۔

مسلم مفکرین کی ابتدائی کوشش

چنانچہ اٹھارویں صدی کے عالم اسلام کی مایہ ناز شخصیات جیسے برصغیر کے شاہ ولی اللہؒ یمن کے محمد بن اسماعیل الامیرؒ اور سعودی عرب کے محمد بن عبدالوہاب نے اس سطحی قیاس کا علمی محاکمہ پیش کیا۔ اسی طرح انیسویں صدی میں مصر کے مفتی محمد عبدہ اور الجیریا کے امیر عبدالقادر جبکہ بیسویں صدی میں علامہ محمد اقبال، جمال الدین افغانی اور شکیب ارسلان نے اسی مقصد کے حصول کیلئے امت مسلمہ کو درپیش عقلی اور ذہنی چیلنجز کو سامنے رکھتے ہوئے کوشش

شروع کی۔ بیسویں صدی عیسوی میں مصر میں حسن البنا اور نقیب العطاس، برصغیر میں مولانا مودودی اور انڈونیشیا میں محمد ناصر اور اسماعیل راجی الفاروقی نے امت مسلمہ کو عالمی افق پر جلوہ گر کرنے اور سیاسی کامیابیاں سمیٹ لینے کی امیدیں اپنے اندر پیدا کیں۔[3]

علوم اسلامی کے متعلق علماء غرب اور وہاں کے جدید سائنسدانوں کی اس مخصوص سوچ کی نفی کیلئے عالم اسلام کے شرق و غرب میں یہ کوششیں کی گئیں۔ اسلام جدید سائنسی علوم کا نہ تو انکار کرتا ہے اور نہ ہی انہیں وحی پر فائق سمجھتا ہے بلکہ تمام سائنسی ایجادات کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ اور بفضل خداوندی آج تک کسی بھی سائنسی ایجاد نے وحی کی بالادستی کو چیلنج نہیں کیا بلکہ علم الیقین سے عین الیقین اور حق الیقین کے درجات تک پہنچانے کیلئے معاونت کا کام سر انجام دیا ہے۔ اسلئے اسلامیت علوم سے مراد وحی کو واپس اپنا مقام دلانے اور

Unchallengeable and Unlimited Domain and jur isdiction کو تسلیم کرنا ہے۔

اس کے ساتھ سائنسی علوم کی اسلامی علوم کے ساتھ مخاصمانہ اور حریفانہ سوچ کی بے ثباتی کو دلائل کے ساتھ سامنے لانا ہے۔ اور اس کے ذریعے امت کو نہ صرف موجودہ بحران سے نکالنا ہے بلکہ شرق و غرب کی تمام انسانیت کیلئے فائدہ تلاش کرنا ہے۔ کیونکہ اصل مسئلہ سائنسی علوم کو مستند علم وحی سے کاٹ کر ان کے درمیان خلیج اور امتیاز پیدا کیا گیا ہے۔ بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے ان دونوں کو مقابلہ میں لا کھڑا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسلامیت علوم کے ذریعے جدید سائنسی علوم کو وحی کا حامی اور معاون ثابت کرنا ہے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو یکطرفہ سوچ کے حامل محدود انسانی ذہنیت کے سبب وجود میں آنے والے مہلک ہتھیار کا ایجاد و استعمال امن عالم کو خطرے میں ڈال سکتا ہے۔ اس سے بڑھ کر نت نئے کیمیائی اور جراثیمی ہتھیار نے پوری انسانیت کو اپنی لپیٹ میں لیا ہے۔ اگر ان سائنسی ایجادات کو علوم وحی کے تناظر میں دیکھا جاتا تو کبھی بھی یہ بے مہار اور بے لگام نہ ہوتا۔ دنیا صرف مفید اور مثبت پہلو کو مد نظر رکھتے ہوئے آگے بڑھتی۔ لہذا اسلامیت علوم کا مقصد نہ صرف امت مسلمہ کو بام عروج پر پہنچانا ہے بلکہ تمام انسانوں کی خیر خواہی اس میں مضمر ہے۔ اور اسلامیت علوم بقاء عالم انسانیت کیلئے ایک ناگزیر اور حقیقت ضرورت بن چکی ہے۔

اس تحقیق کے بنیادی سوالات درج ذیل ہیں۔

1۔ اسلامیت علوم کی ضرورت اور مقصد کیا ہے؟

2۔ اس مقصد کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کیلئے درکار افراد کی اہلیت کیا ہونی چاہئے؟

3۔ اسلامیت علوم کا عملی طریقہ کار کیا ہو گا؟

4۔ ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کا اس بارے میں کیا موقف ہے؟ اور اس کے موقف کا تنقیدی جائزہ بھی پیش کیا جائے گا۔

چنانچہ سب سے پہلے اسلامیت علوم کی ضرورت کو ہم اس میدان میں گہری نظر رکھنے والی، پاکستان کی مایہ ناز شخصیت ڈاکٹر محمود احمد غازی کے الفاظ میں بیان کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں۔

اسلامیت علوم کی ضرورت اور اہمیت

پاکستان کے ممتاز اسلامی سکالر مرحوم ڈاکٹر محمود احمد غازی نے اس کام کی اہمیت اور Urgency یعنی اسے فوری کیے جانے کے حوالے سے ایک دفعہ کہا تھا: علوم کی تنقید و تنقیح کے اس عظیم الشان کام کے لیے اب تاریخ ہم کو شاید مزید مہلت نہ دے۔ اگر مستقبل قریب میں بھی ہم کچھ کر لینے میں کامیاب ہو گئے تو خیر ورنہ اسلامی اقدار اور اسلامی تہذیب کا احیاء ایک خواب و خیال ہو کر رہ جائے گا بلکہ تغیر پیہم کی اس دنیا میں ہمارے لیے اپنا ملی وجود برقرار رکھنا بھی ممکن نہ رہے گا[4]۔

دنیا میں سرانجام دیے جانے والے ہر عمل کا کوئی نہ کوئی دنیاوی یا اخروی مقصد ہوا کرتا ہے۔ اسلئے کہ بلا مقصد کام کرنا عبث ہے۔ اور اللہ پاک نے مومن کی ایک صفت یہ بیان کی ہے کہ وہ لغو اور عبث کاموں سے اجتناب کرتا ہے۔ واللذین ھم عن اللغو معرضون[5]۔ چنانچہ اس بابت ڈاکٹر محمد امین درج ذیل مقاصد بیان کرتے ہیں۔

اسلامیت علوم کے بنیادی اغراض و مقاصد

1۔ پہلا مقصد یہ ہے کہ ہمیں یہ تشکیلِ نو اسلامی تناظر میں کرنی ہے۔ یعنی اس تشکیلِ نو کی بنیاد قرآن و سنت ہوں گے گویا کہ Back to Roots کے اصول پر عمل ہو کیونکہ ہر قوم و تہذیب کی بقاء کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ وہ اپنے نظریۂ حیات سے جڑی رہے اور افراد اس کے مطابق اپنی زندگی گزاریں۔

2۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ تشکیلِ نو کا یہ کام کرتے ہوئے مغربی فکر و تہذیب کو اصولی طور پر رد کرنے کا فیصلہ کیا جائے کیونکہ مغربی فکر و تہذب بنیادی طور پر اسلامی تعلیمات کی ضد ہے۔ یہ اصول طے کرنے کے بعد اور اس پر عمل کرتے ہوئے البتہ یہاں ایسی کچھ چیزیں مشروط و محدود طور پر لینے کا سوچا جاسکتا ہے جو مباحات، معروفات اور انسانی تجربات کی نوعیت کی ہوں اور (Value Loaded) نہ ہوں۔ اس بات سے بھی صَرف نظر نہیں کیا جاسکتا کہ نہ صرف مغربی فکر و تہذیب غیر اسلامی اور مبنی بر الحاد ہے بلکہ اس کی علم بردار مغربی قوموں کا رویہ بھی مسلم امہ کے ساتھ دشمنی پر مبنی ہے اور یہ مسلم امہ کی نشاۃ ثانیہ میں بھی مزاحم ہیں۔

3۔ تعلیم کی اسلامی تشکیل نو کا تیسرا بڑا مقصد وحدتِ تعلیم کا تصور ہے کیونکہ تعلیم کی ثنویت کا تصور اسلامی تعلیمات کے صریحاً خلاف ہے۔ تعلیم کی موجودہ صورتِ حال مغرب کی الحادی فکر و تہذیب سے مرعوبیت کا نتیجہ ہے اور یہ اسلامی سپرٹ کے بھی خلاف ہے کیونکہ اسلام میں نہ تو سیکولرزم ہے اور نہ دین و دنیا کی کوئی تفریق۔

4۔ چوتھا مقصد یہ ہے کہ تعلیم بذاتِ مطلوب اور آخری غایت نہیں بلکہ یہ ذریعہ ہے تربیت اور تزکیۂ نفس کا جیسا کہ قرآن حکیم نے واضح کیا ہے کہ تعلیمِ کتاب و حکمت کا اصل مطلوب تزکیۂ نفس ہے تاکہ یکسو مسلم شخصیت پروان چڑھ سکے۔ ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ صرف تعلیم کی اسلامی تشکیل نو ہی کافی نہیں بلکہ نظامِ تربیت کی تشکیل نو بھی ضروری ہے[6]۔

اب آتے ہیں دوسرے سوال کی طرف اس عمل کو سرانجام دینے والے افراد کی اہلیت کیا ہے؟

کیونکہ ہر کام کی انجام دہی کیلئے مطلوبہ صلاحیتوں کے حامل افراد کی دستیابی ضروری ہے۔ اسی طرح اسلامیت علوم کیلئے بھی افراد اور رجال کار ضروری ہیں۔ چنانچہ ایسے افراد کے متعلق امین محمد لکھتے ہیں۔

تعلیم کی اسلامی تشکیلِ نو کا کام ایک بڑا چیلنج ہے۔ اور تعلیمی عمل کے جن چھ (6) اجزاء یا محاذوں کا ہم نے اُوپر ذکر کیا ہے ان میں سے ہر ایک کے لیے خصوصی صلاحیت، محنت اور مہارت درکار ہے تاہم طوالت سے بچتے ہوئے یہاں ہم بطور مثال صرف نصابات اور تربیت کی تشکیلِ نو کے لیے درکار اہلیتوں کا ذکر کریں گے۔

نصاب کی اسلامی تشکیلِ نو کے لیے درکار اہلیت

یہ صحیح ہے کہ انفرادی سطح پر ایک سکول یا کالج خود اپنا نصاب اور نصابی کتب تیار نہیں کر سکتا بلکہ حکومت یا پرائیویٹ سطح پر نصابی کتب تیار کرنے والے ادارے جو کتابیں تیار کرتے ہیں سکول و کالج وہی کتابیں خرید کر پڑھاتے ہیں۔ جبکہ یونیورسٹی کا معاملہ اس سے الگ ہوتا ہے کیونکہ ہر یونیورسٹی ایک خود مختار ادارہ (Autonomous body) ہوتا ہے اور اپنے نصابات خود تشکیل دے سکتا ہے۔ تاہم کوئی حکومتی یا پرائیویٹ ادارہ، اگر نصابی کتب اسلامی تناظر میں تیار کرنا چاہتا ہو تو اسے اس کام کے دائرہ کار اور مقاصد کا ادراک ہونا چاہیے یعنی متون قرآن و سنت کا مطالعہ، عمرانی و سائنسی علوم کی اسلامی تناظر میں تدوین، تعلیمی ثنویت کا خاتمہ یعنی دینی و دنیاوی علوم دونوں کی بیک وقت تدریس اور تربیت و تزکیہ یعنی علم کے ساتھ اقدار کی طلبہ تک منتقلی۔ تاکہ بچہ جب تعلیم کے مرحلے سے فارغ ہو اور عملی زندگی میں قدم رکھے تو ضروری علمی و فنی مہارتیں رکھنے کے ساتھ وہ صالح مسلمان بھی ہو۔ بہر حال نصاب کی اسلامی تناظر میں تدوین و تشکیلِ نو پر کام کرنے والے افراد میں مندرجہ ذیل اہلیتیں یا خوبیاں ہونی چاہئیں۔ یاد رہے کہ بین الاقوامی ادارہ فکر اسلامی امریکہ کے بانی ڈائریکٹر پروفیسر ڈاکٹر راجی الفاروقی شہیدؒ نے علوم کی اسلامائیزیشن کرنے والے فرد میں دس خصوصیات کا ذکر کیا ہے جنہیں ہم نے اختصار کے ساتھ چار نکات میں سمو دیا ہے۔

1۔ اس کا اسلامی علوم و معارف کا گہرا اور وسیع مطالعہ ہونا ضروری ہے تاکہ اسے اندازہ ہو کہ وہ کون سی بنیادی اور ضروری دینی تعلیمات ہیں جو اسے طلبہ تک منتقل کرنی ہیں۔ اس کام میں تربیت اور تعمیر سیرت کا ہدف بھی اس کے سامنے رہنا چاہیے۔

2۔ ایسا شخص مغربی فکر و تہذیب کا وسیع اور گہرا مطالعہ رکھتا ہو بلکہ اس نے اسلام اور مغربی فکر و تہذیب کا تقابلی مطالعہ کر رکھا ہو تاکہ اسے بخوبی اندازہ ہو کہ مغربی افکار و تصورات اسلامی تعلیمات سے مختلف و متضاد ہیں اور الحاد و دہریت پر مبنی ہیں۔ لہٰذا وہ شعوری طور پر اسلامی افکار، تصورات اور اصطلاحات بچوں کے سامنے لائے اور مغربی تہذیب کے افکار، تصورات اور اصطلاحات بچوں کے سامنے نہ لائے۔ یا اگر کسی سطح پر ان کا لانا ناگزیر ہو تو ان پر تنقید کرتے ہوئے بتائے کہ یہ غلط اور خلاف اسلام ہیں لہٰذا ایک مسلمان کے لیے قابل قبول نہیں بلکہ قابل رد ہیں۔

3۔ اسے بچوں کی عمر اور ذہنی سطح و نفسیات کا اندازہ ہو تاکہ اسے پتہ ہو کہ کون سی بات طلبہ کو کب بتانی اور سکھانی ہے؟

4۔ نصاب سازی اور نصابی کتاب کی تدوین خود ایک فن ہے۔ جو اس شخص اس فن میں مہارت نہ رکھتا ہو وہ اس کام کا حق ادا نہیں کر سکتا[7]۔

اب آخر میں بات اس طریقہ کار پر آجاتی ہے۔ کہ تمام عمل کیسے سر انجام دیا جائے۔ اس کیلئے کیا منہج اپنایا جائے؟ اس بابت ڈاکٹر محمد امین فرماتے ہیں۔

علوم کے تشکیل نو کا طریقہ کار

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر نصاب اچھا ہو یعنی اسلامی تعلیمات اور تقاضوں کے مطابق ہو اور مغربی فکر و تہذیب سے متاثر نہ ہو تو اس سے تعلیم کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نظام تعلیم میں نصاب بنیادی اہمیت رکھتا ہے اور اس کا صحیح ہونا ضروری ہے. لیکن ہماری سوچی سمجھی رائے یہ ہے کہ نظام تعلیم سے موثر نتائج لینے کے لیے صرف نصاب کی اصلاح کافی نہیں بلکہ نظامِ تعلیم کے سارے اجزاء کی اصلاح اور ان کا صحیح خطوط پر استوار ہونا ضروری ہے۔ اَب ہم اختصار کے ساتھ ایک ایک کر کے نظامِ تعلیم کے ان اجزاء کا ذکر کریں گے کہ وہ کس طرح تعلیم کی اسلامی تشکیلِ نو میں اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں:

1۔ **تعلیمی انتظامیہ:** تعلیم کی اسلامی تشکیلِ نو کے کام میں بنیادی ذمہ داری تعلیمی انتظامیہ (مالک یا منتظم / ڈائریکٹر یا پرنسپل) کی ہے کیونکہ اساتذہ کے انتخاب، نصابی کتب کے تعین، طلبہ کی داخلہ پالیسی، نصابی و ہم نصابی سرگرمیوں اور تعلیمی ادارے کے ماحول کے بارے میں بنیادی فیصلے ڈائریکٹر یا پرنسپل نے ہی کرنے ہوتے ہیں۔ اگر اس کے پیشِ نظر تعلیم کی اسلامی تشکیلِ نو ہو تو وہ دین دار اساتذہ تلاش کرے گا اور ان کی تربیت کرے گا۔ وہ ایسی نصابی کتب تلاش کرے گا جو اسلامی تناظر میں مدون کی گئی ہوں، وہ ادارے کے ماحول کو اسلامی تقاضوں کے مطابق ڈھالے گا اور نصابی سرگرمیوں کا اہتمام بھی اسلامی تناظر میں کرے گا۔

2۔ **معلم کا کردار:** معلم تعلیم کی اسلامی تشکیلِ نو میں اہم ترین کردار ادا کر سکتا ہے۔ اگر نصاب اسلامی لحاظ سے ناقص ہو تو وہ اس کی کمی پوری کر سکتا ہے اور اپنے پاس سے نصاب میں ضروری اضافے کر سکتا ہے۔ یا اگر نصابی کتب میں اسلامی لحاظ سے غیر مفید اور قابل اعتراض مواد موجود ہو تو وہ صحیح اسلامی تناظر میں اس مواد کو اس طرح پڑھا

سکتا ہے کہ طلبہ اس غیر معیاری اور غیر مفید نصاب سے متاثر نہ ہوں۔ معلم طلبہ کی اسلامی تربیت کر سکتا ہے اور اپنے اچھے کردار سے ان کے لیے بہترین نمونہ بن سکتا ہے۔ بلکہ ہم تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر انتظامیہ طلبہ کو 'صالح مسلمان' بنانے میں دلچسپی نہ رکھتی ہو اور نصاب بھی موزوں نہ ہو تو اس کے باوجود ایک متدین استاد سلیقے اور حکمت سے اپنا کردار موثر انداز میں ادا کر سکتا ہے بشرطیکہ اسے اپنی ذمہ داری کا احساس ہو اور وہ اپنا کام سلیقے اور حکمت سے کر سکتا ہو۔

3۔ **نصاب:** نصاب ایسا ہونا چاہیے جو اسلامی ضرورتوں اور تقاضوں کو پورا کر سکتا ہو۔ اس کے دو اہم پہلو ہیں: ایک تو یہ کہ ضروری دینی معلومات اس کا حصہ ہونی چاہئیں جیسے قرآن حکیم کی تعلیم (ناظرہ، تجوید، ترجمہ اور حفظ) اور احادیث رسول ﷺ کی تعلیم، حلال و حرام کا علم۔ نماز، روزے، زکوۃ، حج کے مسائل جاننا وغیرہ۔ اور دوسرے یہ کہ سماجی و سائنسی علوم کو اسلامی تناظر میں مدون کیا جانا ضروری ہے اور دینی علوم میں تخصص کا انتظام بھی ناگزیر ہے۔ خواتین کے لیے الگ نصاب بنایا جانا چاہیے جو اِن کی صنفی ضرورتوں کو پورا کرتا ہو۔

4۔ **طلبہ:** تعلیمی ادارے کی پالیسی ایسی ہونی چاہیے کہ ذہین، طبع سلیم رکھنے والے، محنتی اور دینی ذہن کے طلبہ کی حوصلہ افزائی ہو۔ طلبہ کی عمر ایسی ہوتی ہے کہ اگر تعلیمی ادارہ، استاد یا پرنسپل محبت و شفقت سے اسے بدلنا چاہے تو وہ ایسا کر سکتا ہے۔ اس ضمن میں ضرورت ہو تو طلبہ کے والدین سے بھی مدد لینی چاہیے۔ تعلیمی ادارے کا کام جہاں اچھے طلبہ کی صلاحیتوں کو جِلا دینا ہے وہاں برے اخلاق کے حامل طلبہ کی اصلاح بھی اسی کا فریضہ ہے۔ بگڑے بچے کی اصلاح مسلسل اور دیرپا محنت کی متقاضی ہوتی ہے۔ یہ محنت صبر و استقلال سے جاری رہنی چاہیے تاہم اگر کوئی طالب علم تعلیمی ادارے میں دوسرے طلبہ کے اخلاق خراب کرنے کا سبب بن رہا ہو اور پیہم کوششوں کے باوجود اصلاح قبول نہ کرے تو بطور استثنیٰ اس سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔

5۔ **نصابی و ہم نصابی سرگرمیاں:** نصابی و ہم نصابی سرگرمیاں طلبہ کی تعمیر سیرت میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ مطلب یہ کہ صرف نصاب کا اسلامی ہونا کافی نہیں اور صرف استاد کا ایسا نصاب پڑھا دینا اور زبانی وعظ و نصیحت کر دینا ہی کافی نہیں بلکہ ایسی تعلیمی سرگرمیاں ضروری ہیں جو طالب علم کی تعمیر سیرت کے کام میں مدد و معاون ہوں جیسے

مختلف ایام کے موقع پر تقریبات کا انعقاد (مثلاً یومِ بدر، یومِ استقبال رمضان وغیرہ) یا جیسے مختلف جگہوں اور کاموں کے مقامات کا دورہ کرنا یا طلبہ کی تقریری، تحریری اور تفریحی سرگرمیوں کی تنظیم وغیرہ۔ ان سرگرمیوں کے انجام دینے کا رخ اور انداز اگر مقصدیت لیے ہوئے ہو اور انتظامیہ اور استاد ایسے مواقع پر طلبہ کی رہنمائی کریں تو یہ سرگرمیاں طلبہ کی اسلامی ذہن سازی میں اہم کردار ادا کر سکتی ہیں۔

6۔ **تعلیمی ادارے کا ماحول:** اگر مذکورہ بالا عوامل صحیح رخ میں کام کر رہے ہوں اور تعلیمی ادارے کے ماحول کو تعمیری اور اسلامی بنانے کی طرف انتظامیہ اور استاد کچھ مزید توجہ دیں تو طلبہ کی صحیح رخ میں ذہن سازی ہو سکتی ہے جیسے سکول آتے ہوئے وقت کی پابندی، تعلیمی ادارے کی صفائی کے لیے قریب ترین بچے کی ذمہ داری، طالب علم کے جسم و لباس کی صفائی، مخلوط تعلیم اور سرگرمیوں سے پرہیز وغیرہ تو درس گاہ کا ماحول بھی طلبہ کی اسلامی تربیت میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے[8]۔

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کے نظریہ اسلامیت علوم کا تنقیدی جائزہ

تعارف:

ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی 1931 میں ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اپنی تعلیم علی گڑھ یونیورسٹی سے مکمل کی جہاں وہ معاشیات اور اسلامک اسٹڈیز کے ایسوسی ایٹ پروفیسر بھی رہے۔ ڈاکٹر صدیقی نے جدہ کی کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی کے اسلامی معاشیات کے مرکز برائے تحقیق میں بھی تدریسی خدمات انجام دیں اور لاس اینجیلس میں یونیورسٹی آف کیلی فورنیا کے مرکز برائے مطالعاتِ مشرق کے بھی فیلو رہے۔ دنیا بھر میں سفر کرنے والے یہ اہلِ علم جدہ میں اسلامی ڈیولپمینٹ بنک کے اسلامی تحقیق و تربیتی ادارہ کے بھی وزیٹنگ اسکالر رہے۔ ان کی کئی مشہور تصنیفات ہیں ۔ آپ نے اسلامیت علوم کے بارے میں ایک مضمون لکھا جس کا عنوان درج ذیل ہے[9]۔

عنوان: علوم کی اسلامی تشکیل جدید: ترجیحات کیا ہوں؟

اس مضمون کے مختلف حصوں اور چیدہ چیدہ نکات کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔ جو کہ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے محقق نے اس مضمون کو سات حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

1۔ تمہید 2۔ سوالیہ نشان 3۔ تجربوں سے سبق 4۔ ممکنہ جوابات
5۔ آنے والے کل کا رخ متعین نہیں کیا جاسکتا 6۔ سوشل سائنسز کا اسلامائزیشن 7۔ مستقبل کا ایجنڈا

اسلامیت علوم کا آغاز

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی فرماتے ہیں کہ عالم اسلام میں احیاء اسلام کی کوششوں کا آغاز اٹھارویں صدی سے ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ برصغیر کے شاہ ولی اللہ ہوں، یمن کے محمد بن اسماعیل الامیر ہوں یا سعودی عرب کے محمد بن عبدالوہاب ہوں ان سب نے خالص قرآن وسنت پر مشتمل اسلام کی طرف امت مسلمہ کو واپسی کی دعوت دی کیونکہ اس کے کھو جانے پر امت مسلمہ طاغوتی قوتوں کے شکنجے میں قید لگی تھی۔ اسی طرح انیسویں صدی میں مصر کے مفتی محمد عبدہ اور الجیریا کے امیر عبدالقادر جبکہ بیسویں صدی میں علامہ محمد اقبال، جمال الدین افغانی اور شکیب ارسلان نے اسی مقصد کے حصول کیلئے مسلمانوں کو درپیش عقلی اور فکری چیلنجز کو دیکھتے ہوئے اپنی عظمت رفتہ بحال کرنے کیلئے ٹھان لی۔ اسی طرح مصر میں حسن البناء، برصغیر میں مولانا مودودی اور انڈونیشیا میں محمد ناصر نے اسلام کے احیاء اور سیاسی طور پر مضبوط اور استوار کرنے کی منصوبہ بندی کرلی۔ علوم کے اسلامیانے کی تحریک درحقیقت انہی کاوشوں کا نام ہے[10]۔

تجزیہ: اٹھارویں صدی عیسوی میں پورے عالم اسلام میں احیاء اسلام کی کوششیں کی گئیں۔ اسے حسن اتفاق ہی کہا جاسکتا ہے کہ عالم اسلام کی مختلف شخصیات نے اپنے اپنے ممالک میں اس فکر کو پنپنے اور اس کی ترویج میں اپنا کردار ادا کیا۔ وگرنہ اس بات کے بہت کم امکانات ہیں کہ انہوں نے باہمی مشورے سے اس کام کا آغاز کیا ہو۔ البتہ ایک ایسے مقام پر ان کا اجتماع بھی ممکن ہے، جہاں دنیائے اسلام کے مسلمان ہر سال اکٹھے ہوتے ہیں، اور وہ ہے حرمین شریفین ۔ اسلئے قرینہ قیاس یہ ہے کہ اس مقدس مقام پر اجتماع ہوا ہو ان عظیم ہستیوں کا۔ اور وہاں سے اس سوچ وفکر کو عملی جامہ پہنانے کا الہی منصوبہ بندی کا آغاز کیا گیا ہو۔

تمہید میں ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی ڈاکٹر اسماعیل راجی الفاروقی کی دو اقتباسات نقل کرتے ہیں۔ جو وہ اپنی مشہور کتاب Islamization of knowledge : General Principle and Plan۔ کی تمہید میں ذکر کرتے ہیں

1۔ امت مسلمہ کو عطاء کردہ خلافت کا مقصد یہ ہے کہ وہ تہذیب و ثقافت کو نہ صرف استوار کرے بلکہ اس کی آبیاری بھی کرے۔ انسانی معاشرے میں امن قائم ہو۔۔۔۔۔۔ اسی لئے قرآن کریم نے خلافت کا تصور سیاسی قوت سے جوڑا ہے۔

2۔ ذات کی آگہی کا مطلب دوسروں سے اپنے امتیاز کی آگہی ہے۔ یہ امتیاز مادّی ضروریات اور افادی حقائق کے اعتبار سے نہیں بلکہ تصور کائنات، اخلاقی حس اور روحانی رفعتوں کے اعتبار سے ہے۔ دور حاضر میں جدید ہونے کا مطلب تہذیبی شعور ہے یعنی اپنے تہذیبی ورثہ کا شعور رکھنا، اس کے مختلف مظاہر کو وجود بخشنے والی قوت محرّکہ سے واقف ہونا اور تاریخ کے دوسرے تہذیبی دھاروں سے ممتاز ہونے کا شعور اور مستقبل میں اس کی سمت سفر کو صحیح رکھنے والی قوتوں سے پوری طرح باخبر رہنا۔ اس ناگزیر معلومات کے بغیر اپنا تشخص برقرار رکھنا تو درکنار اس دنیا میں اپنا تہذیبی وجود قائم رکھنا بھی ممکن نہیں[11]۔

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کا تجزیہ:

ان دو اقتباسات کو نقل کرنے کے بعد ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی فرماتے ہیں کہ علم کے اسلامیانے کی پوری تحریک دراصل ایک سیاسی مقصد رکھتی ہے۔ یعنی جدید دنیا میں جاری تہذیبوں کی کشمکش میں اسلام کی فتح اور اس کا غلبہ اس تحریک کے علمبرداروں کے نزدیک قرآنی تصور "خلافت" کا جوہر اور اس کی روح ہے۔ دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ اس نصب العین کے احیاء اور نشاۃ ثانیہ میں جن کی قوتیں صَرف ہونگی وہ عالمی انسانی برادری نہیں بلکہ امت مسلمہ کے افراد ہیں[12]۔

تجزیہ: خالق کائنات نے دین اسلام کو اس دنیا میں تمام ادیان پر غالب ہونے کیلئے بھیجا ہے۔ جیسے کہ قرآن کریم میں ہے۔ هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ۔ چنانچہ یہ دین ابتداء و آغاز میں تمام ادیان پر غالب آیا اور پوری دنیا کو اس کے علمبرداروں نے امن و آشتی کا گہوارہ بنا دیا تھا۔ اللہ رب العزۃ نے انسانوں

کے درمیان صرف ایک ہی لکیر کھینچی ہے وہ ہے کفر واسلام کی سرحد۔ چنانچہ دنیا کا ہر باسی اس حکم کا مخاطب ہے کہ وہ اللہ پاک کے پسند کردہ دین کو اختیار کرے اور پھر اس کے دستور اور منشور کو پوری دنیا میں حسب استطاعت عام کرے۔ تاکہ منشائے خداوندی پایہ تکمیل کو پہنچے۔ چنانچہ علوم کو اسلامیانے کے براہ راست مخاطب تو مسلمان ہیں ،البتہ بالواسطہ تمام انسان اس کے مخاطب ہیں کہ وہ پہلے اسلام کو اپنائیں اور پھر تمام علوم کو اسلامی نقطہ نظر سے دیکھیں۔ جو چیز کسی بھی پہلو سے وحی اور اس کی روح کے موافق نہ ہو اسے مسترد کریں۔ اور جو وحی کے موافق ہے اسے اپنالیں۔

الحاصل بار خلافت تو جنس انسان پر ڈالی گئی ہے لیکن اس کو بالفعل سرانجام دینے والا صرف وہ انسان ہے جو حلقہ بگوش اسلام ہو چکا ہو۔ اور جس نے "عہد الست" میں کئے گئے وعدے کو پس پشت ڈال دیا ہے وہ اپنے وعدے سے پھر چکا ہے گویا اس نے بار خلافت اٹھانے سے عملاً انکار کر دیا ہے۔ حالانکہ وہ رب کی عبدیت کا اقرار کر چکا تھا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَى أَنفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَى [13]"۔ چنانچہ اس کی تین صورتیں بنتی ہیں۔

1۔ دین اسلام کو اپنائے بغیر وہ مادی قوانین و ضوابط سے آگاہی حاصل کرتے ہوئے موجودات عالم سے فائدہ اٹھاتا ہے تو وہ اشیاء اپنی فطری تاثیر دکھانے اور مطلوبہ نتیجہ دینے کے مکلف و پابند ہیں۔ تو وہ اس دنیا میں ضرور ان سے فائدہ اٹھائے گا اور خلاؤں میں پرواز کرے گا۔ لیکن اس کے یہ تمام کارنامے خلیفہ ہونے کے ناطے نہیں بلکہ ایک باغی ہونے کے ناطے ہیں۔

2۔ وہ شخص جس نے خالق کائنات کے منشور و دستور کو مانتے ہوئے موجودات عالم سے فائدہ اٹھایا تو اس نے پورے طور پر خلافت کا حق ادا کیا۔

3۔ تیسری صورت یہ ہے کہ اس نے فرمان خالق تو مانا ہے لیکن تسخیر کائنات کیلئے ضروری علم حاصل نہیں کیا تو یہ دنیاوی ترقی سے محروم رہا اور دین اسلام کی اشاعت میں یہ کوئی کردار ادا نہیں کر سکا۔ گویا یہ منصب خلافت پر براجمان تو ہے لیکن دوسروں کو اس عظیم منصب پر فائز کرنے کی خدائی منشا کو اس نے عملی جامہ پہنانے کی ذرہ برابر کو شش نہیں کی۔ جس کی وجہ سے خلافت ربانی کا پورا حق ادا نہیں کیا۔ چنانچہ یہ منصب خلافت پر متمکن ہونے کے باوجود محکوم ہے اور دوسرا شخص منصب خلافت سے دور ہونے کے باوجود موجودات عالم کو مسخر کرنے کی بناء پر حاکم ہے۔

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی مولانا مودودیؒ کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

مولانا مودودی کے خیال میں بھی عالمی سربراہی کے حصول کی کنجی علم ہی میں ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس دنیا میں امامت و قیادت کا مدار آخر ہے کس چیز پر؟ کیا چیز ہے جس کی بنا پر کبھی مصر امام بنتا ہے اور دنیا اس کے پیچھے چلتی ہے۔ کبھی بابل امام بنتا ہے اور دنیا اس کی پیروی کرتی ہے کبھی یونان امام بنتا ہے اور دنیا اس کی اتباع کرتی ہے، کبھی اسلام قبول کرنے والی اقوام امام بنتی ہیں اور دنیا ان کے نقشِ قدم پر ہو لیتی ہے، اور کبھی یورپ امام بنتا ہے اور دنیا اس کی تابع بن جاتی ہے؟ پھر وہ کیا چیز ہے جس کی وجہ سے امامت آج ایک کو ملتی ہے، کل اس سے چھن کر دوسرے کی طرف چلی جاتی ہے، اور پرسوں اس سے بھی سلب ہو کر تیسرے کی طرف منتقل ہو جاتی ہے؟ کیا یہ محض ایک بے ضابطہ اتفاقی امر ہے یا اس کا کوئی ضابطہ اور اصل مقرر بھی ہے؟ اس مسئلہ پر جتنا زیادہ غور کیا جائے اس کا جواب یہی ملتا ہے کہ ہاں اس کا ضابطہ ہے، اور وہ ضابطہ یہ ہے کہ امامت کا دامن ہمیشہ علم سے وابستہ رہے گا۔ انسان کو بہ حیثیت ایک نوع کے زمین کی خلافت ملی ہی علم کی وجہ سے ہے۔ اس کو سمع، بصر، اور فواد تین چیزیں ایسی دی گئی ہیں جو دوسری مخلوق ارضی کو یا تو نہیں دی گئی ہیں یا اس کی بہ نسبت کم تر دی گئی ہیں۔ اس لئے وہ اس بات کا اہل ہوا کہ دوسری مخلوقات پر خداوندِ عالم کا خلیفہ بنایا جائے اب خود اس نوع میں سے جو طبقہ یا گروہ علم کی صفت میں دوسرے طبقوں اور گروہوں سے آگے بڑھ جائے گا وہ اسی طرح ان سب کا امام بنے گا جس طرح انسان من حیث النوع دوسری انواع ارضی پر اسی چیز کی وجہ سے خلیفہ بننے کا اہل ہوا ہے[14]۔

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی درجہ بالا عبارت نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں

مولانا اپنے اس مجوزہ منصوبہ میں انسان کو ودیعت کی گئی روحانی بصیرت اور حُسنِ اخلاق سے علم کو مزین کرنے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں تاکہ انسانی زندگی خدائے عظیم کی مرضی کے مطابق ہو سکے اور دنیا اور آخرت میں کامیابی سے ہمکنار ہو جائے۔ اہم بات یہ ہے کہ مولانا صرف مسلمانوں ہی کو خطاب کر رہے ہیں اور فکر کے یہ زاویے اور اخلاق کے نمونے جن کی پیروی کی دعوت دی جارہی ہے وہ مسلمانوں کے تاریخی ورثہ کا حصہ ہیں۔ جو چیز موجود نہیں ہے وہ دراصل اجتہاد ہے کہ پہلے سے موجود مستند بات کو نئے حالات میں کس طرح منطبق کیا جائے۔ چنانچہ بہت سے علماء نے عصری اسلامی فقہ میں اجتہادی فکر کی تجدید کرنے پر زور دیا ہے اور کیونکہ فقہ میں اکثر ایسے موضوعات آجاتے ہیں جو جدید دور کی سوشل سائنسز میں شامل ہیں اس لئے اسلامیانے کی تحریک میں سوشل سائنسز کو اہمیت حاصل رہی ہے۔

تجزیہ: اللہ تعالی نے مسلمانوں کو کفار کے مقابلے میں پھرپور قوت اور طاقت کا مظاہرہ کرنے اور تیاری پکڑنے کا حکم دیا ہے۔ جیسے۔ واعدوا لھم ماستطعتم من قوۃ ومن رباط الخیل ،ترھبون بہ عدو اللہ و عدوکم[15] ۔ سے ظاہر

ہے۔اب یہ تیاری جدید مصنوعات بالخصوص جن جنگی ساز وسامان کے ذریعے عالم کفر کو ڈرایا جاسکتا ہے اس پر عبور اور دسترس حاصل کئے بغیر نا ممکن ہے۔سوشل سائنسز کو اسلامیانے کا کام ہوا ہوتا تو آج پوری دنیا چین وسکون سے ہوتی ،کیونکہ مسلمان منشائے خداوندی کے مطابق صرف افادی پہلو ہی اختیار کرتے،اور اس کے مضر وہلاکت خیز پہلوؤں سے اجتناب اور گریز کرتے۔اس کے برعکس مسلمان آج جدید سائنس و ٹیکنالوجی میں پیچھے ہونے کے سبب غیر مسلم اقوام دنیائے انسان پر جنگی،جوہری اور جراثیمی ہتھیار مسلط کر چکے ہیں۔یہ نتیجہ ہے اس بات کا علم اشیاء صالح اور تابع اقوام کے ہاتھوں سے نکل کر غیر صالح اور نافرمان لوگوں کے ہاتھوں میں پڑ گیا۔

اہم نکتہ۔قرآن کریم نے جہاں بھی تسخیر کائنات کی بات کی ہے وہاں "لکم "کا لفظ استعمال کیا ہے۔جیسا کہ ارشاد ہے۔وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَائِبَيْنِ وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ[16] ۔عربی قاعدے کے مطابق لام افادیت کیلئے استعمال ہوتا ہے۔اس کا مقصد یہ ہے کہ "تسخیر کائنات "میں ہمیشہ تعمیری پہلو کو مد نظر رکھنا چاہئے۔

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی آگے فرماتے ہیں۔

اسماعیل راجی کے الفاظ نے اس مات کو مزید تفصیل سے بیان کر دیا ہے۔

چنانچہ اس کے اغراض درجہ ذیل ہیں:

1۔ جدید علوم پر مکمل مہارت حاصل کرنا۔ 2۔اسلامی علوم میں رسوخ پیدا کرنا۔

3۔ جدید علوم اور دینی علوم کے درمیان خصوصی تعلق قائم کرنا 4۔جدید علم اور اسلامی ورثہ کے مابین تخلیقی امتزاج کی راہیں تلاش کرنا۔

5۔اور اسلامی فکر کو ایسے خطوط پر استوار کرنا کہ اللہ تعالیٰ کے اصولوں کا انکشاف ممکن ہو سکے۔

تجزیہ: ان مقاصد میں سے پہلے اور دوسرے مقصد پر مسلمان ممالک میں اچھا خاصا کام ہو رہا ہے۔کیونکہ جدید اور اسلامی علوم کے متخصصین بڑی سطح پر پیدا ہو رہے ہیں۔البتہ اگلے تین مقاصد میں کافی کمی پائی جارہی ہے۔لہذا اس نہج پر کام کی اشد ضرورت ہے۔اگرچہ اٹھارویں صدی عیسوی کے بعد اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے انفرادی اور ادارتی سطح پر کام ہو رہا ہے۔لیکن مسلمان حکومتوں کی بھرپور توجہ سے ہنوز محرومی پائی جارہی ہے۔

حصہ دوم: سوالیہ نشان

اس میں ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی فرماتے ہیں۔امامت یعنی عالمی قیادت کے۔علم۔سے رشتہ اتنا مضبوط نہیں جتنا کہ خلافت اور علم کے باہمی جوڑ مضبوط ہے۔اللہ پاک کی کتاب فرقان مجید اس سلسلہ میں واضح رہنمائی رتا ہے۔دنیاوی

طاقت کو قرآن کریم نے فساد کے برخلاف صلاح سے جوڑا ہے۔ لیکن اس کی بقاء اور قیام قرآن کریم کے مطابق زندگی کا امتحان یعنی ابتلا ہے۔ یہی انسانی زندگی کا خدائی نصب العین ہے اور اسی غرض سے دوسرے ذیلی مقاصد بھی وجود میں آتے ہیں۔

آگے جاکر وہ چند سوالات کرتے ہیں۔

1۔ کیا علم قوت وشوکت پانے کی راہ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے؟

2۔ تخلیق انسانی کے الٰہی مقصد کو ملحوظ رکھتے ہوئے سیاسی قوت کا پانا کتنا اہم ہے؟

3۔ تخلیق علم یا توسیع علم کا تصور، تصور خلافت یا امامت سے کیا نسبت رکھتا ہے؟

4۔ علم قدیم اور علم جدید کے فائدہ مند استعمال کیلئے مناسب ماحول پیدا کرنا امامت اور خلافت کیلئے کس طرح ضروری ہے؟

5۔ کیا یہ اقدام زیادہ مناسب نہ ہو گا کہ بجائے مسلمانوں کی عالمی قیادت یا ان کے غلبہ کی کوشش کے جو بہر حال دشمنان اور مخالفین پیدا کرنے یا ان میں اضافہ کا باعث بن سکتی ہیں، علم کی تخلیق اور اس کے فائدہ مند استعمال کے ذریعہ انسانی بھلائی کے لئے براہ راست کام کیا جائے[17]؟

تجزیہ: اس میں کوئی شک نہیں کہ علم طاقت کے حصول میں سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلئے کہ دنیا میں جب بھی کسی قوم کو عروج ملا ہے وہ اس کی "مادی اشیاء" کا علم حاصل کرنے اور ان کے تسخیر سے ہی ملا ہے۔

2۔ دین اسلام کو اللہ پاک نے تمام ادیان پر سربلند ہونے کیلئے بھیجا ہے۔ اور اس مقصد کے حصول کیلئے سیاسی قوت کا حاصل کرنا ازبس ضروری اور لازمی ہے۔ علم اور بالخصوص اس کی تخلیق کے اپنے تقاضے ہیں۔

3۔ تصور خلافت اور اس کی اشاعت کیلئے علم کی توسیع انتہائی ضروری ہے۔ کیونکہ جس خلافت کو بنیاد بنا کر پوری دنیا میں اس کی اشاعت کی ذمہ داری لی گئی ہے اس کے منشور اور دستور کو بھی وہاں تک پہنچانا ضروری ہوتا ہے۔

4۔ کسی بھی علم سے مطلوبہ مثبت اور مفید نتائج کے حصول کے اندر ارباب حل وعقد کا مثبت اور تعمیری سوچ کارفرما ہوتی ہے۔ خصوصا ایسا کام جس کی وجہ سے دوسرے متاثر ہوتے ہیں۔ اگر وہ تخریبی کام ہو تو اس کے نقصانات زیادہ ہوتے ہیں۔

5۔اس دنیامیں جو بھی جس نظریہ کے ساتھ کام کرے گا،اس کے اندر کام سرانجام دینے والے کی سوچ و فکر لازمی شامل حال ہو گی۔ یہ ناممکن ہے کہ انسان کوئی ایسا کام کرے کہ اس کے اپنے افکار و خیالات کو اس پر اثر نہ ہو۔

لہذا آزادیِ خیال اورآزادی اظہار رائے علم کی تخلیق اور اس کے نشوونما کے لئے بہت اہمیت کے حامل ہیں۔۔نئے علوم کی داغ بیل افراد ہی ڈالتے ہیں۔ جو اکثر جماعت کی شکل میں رضاکاراہوا کرتے ہیں۔ مختلف ادارے ، یونیورسٹیاں یادار التراجم وغیرہ میں ماہرین کے لئے بھی مواقع ہوتے ہیں۔جو اس پورے عمل میں بڑی مدد ثابت ہوتی ہیں۔لیکن علوم کی تخلیق کبھی بھی گروہ بندی اور نظم وضبط کے تحت مطلوبہ تفصیلات کے ساتھ عمل میں نہیں آتی۔نہ اس سے پہلے ایسا ہوا ہے اور نہ ہی آئندہ کا کوئی امکان پایا جاتا ہے۔ دوسری طرف یہ یقینی بنالینا کہ علم کا استعمال سود مند ہی ہو گا بعض شرائط اور ضروریات کے ساتھ مشروط ہے۔اور یہ ضروریات تصور کائنات، روحانیت اور زندگی کے اخلاقی وِژن سے گہرا تعلق رکھتی ہیں کیونکہ ان کے بارے میں ہم مزید کچھ علم نہیں رکھتے اس لئے بڑی احتیاط اور صبر سے قدم اٹھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی فرماتے ہیں۔

"اسلامیت علوم کا خطاب صرف اور صرف مسلمانوں سے ہوناتب تو قابل فہم ہے کہ مسئلہ صرف مقامی ہو۔ مالی ضروریات بھی مسلمانوں ہی کے ذریعے پوری ہونے والی ہوں اور اس کے شریک کار بھی مسلمان ہی ہوں۔ لیکن اگر پروجیکٹ ہی اس طرح کا ہو کہ اس میں دوسروں کی شمولیت ہو رہی ہو۔ مثلاً ان کے ماضی کی وراثت سے ہم مستفید ہو رہے ہوں۔ اور ان کے فکر اور ان کے تجربات سے بھی ہم فائدہ اٹھانا چاہتے ہوں۔ تو اس صورتحال میں محض مسلمانوں سے مخاطب ہونے کی کوئی علت سمجھ میں نہیں آتی۔ ایسا لگتا ہے کہ اسلامائزیشن آف نالج کے علمبرداروں کے ذہن میں شاید یہ خیال بھی نہیں آیا کہ اس پورے فیصلہ کو سب کے سامنے رکھنا اور دوسروں سے تعاون حاصل کرنا چاہئے۔ کوئی کسی بھی مذہب، نسل اور مقام سے وابستہ ہو اس مقصد کے حصول میں معاون ہو سکتا ہے۔ "[18]

تجزیہ: ڈاکٹر صاحب کے اس نکتہ کا تعلق اسلامیت علوم کے مخاطبین کے متعلق ہے۔ کہ آیا یہ کام صرف مسلمان سر انجام دیں گے یا تمام انسان؟ میرے خیال میں اس مسئلے کا تعلق ایک اور مسئلہ کے ساتھ ہے۔ وہ یہ کہ اس کے اولین مخاطب تو تمام انسان ہیں۔ جس طرح دین اسلام کے مخاطبین بھی تمام انسان ہیں، اور وہ ایمان لانے کے مکلف ہیں

ایسے ہی ایمان کا تقاضا بھی یہ ہے کہ جو لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوئے ہوں وہ خالق کائنات کے دئے گئے دستور کو رائج کریں۔ اس حوالے سے تو مخاطب تمام انسان ہیں کہ ان کے پاس جو بھی علوم کا ذخیرہ ہے وہ اسے اسلامی بنانے کی بھرپور کوشش کریں۔ لیکن اسی مسئلہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس کام کی انجام دہی عملاً وہ لوگ کریں گے جو ایمان لا چکے ہوں اور خدائی نظام کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا چکے ہوں۔ کیونکہ جو لوگ ابھی تک ایمان نہیں لائے اور دستور خداوندی کو اپنا مشن اور نصب العین نہیں بنایا ان سے اسلامیت علوم کا تقاضا بے سود ہے۔ کیونکہ وہ اس کی افادیت کو تب ہی تسلیم کریں گے جب وہ نظریاتی طور پر اسے اپنا چکے ہوں۔

اس حصہ کے آخر میں ڈاکٹر صاحب ایک اور سوال اٹھاتے ہیں۔ کہ کیا واقعی مسلمانوں کو یہ ذمہ داری سونپی گئی ہے کہ وہ دنیا کی قیادت کریں، غالب ہوں اور اسلام کے مطابق اس کی ترتیب نو کریں۔ کیا مشن یہ ہے کہ اسلام کو عملی اور زبانی طور پر لوگوں تک پہنچا دیا جائے اور اس کی طرف دعوت دی جائے یا یہ پورا عمل عالمی غلبہ کی شکل میں نتیجہ خیز ہونا ضروری ہے؟

تجزیہ: میرے خیال میں ڈاکٹر صاحب یہ سوال کسی شک کی بنیاد پر نہیں، بلکہ اس کی صداقت اور ضرورت کو اقوام عالم کے سامنے لانے کیلئے فرمارہے ہیں۔ کیونکہ جب اللہ پاک نے اسلام کو ہی رہتی دنیا کے انسانوں کیلئے تجویز کیا ہے جیسے کہ ارشاد باری تعالی ہے۔ إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ[19] ۔ اور پھر پوری دنیا میں غالب کرنا اس کا مقصد اور نصب العین گردانا ہے جیسے۔ هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ[20] ۔ سے صاف ظاہر ہے۔ چنانچہ یہ بات ایک متوقع سوال کے پیشگی جواب کے طور پر دیا گیا ہے۔

حصہ سوم: تجربوں سے سبق

گذشتہ چوتھائی صدی کے دوران ان اداروں اور اقدامات کے ذریعہ کیا کچھ حاصل ہوا ہے اس کا ایک ناقدانہ جائزہ خاصا چشم کشا ہو سکتا ہے۔ بدقسمتی راقم الحروف کے پاس نہ تو وسائل ہیں اور نہ ہی اتنی قوت کار جو اس تفصیلی جائزہ کے لیے ضروری ہے۔ لیکن جماعت اسلامی ہند کی ثانوی درسگاہ کا بطور طالب علم تجربہ اور پھر مذکورہ یونیورسٹیوں سے بطور مشیر میری وابستگی اور پھر جدہ میں قائم اسلامک اکنامکس کے سینٹر سے میری وابستگی جو کوئی دو دہائیوں تک محیط

ہے۔ میرے ان تاثرات کو اعتبار فراہم کرتی ہے۔ نصف صدی تک محیط یہ تمام کوششیں یقیناً ضائع نہیں ہوئیں۔ لیکن یہ کہنا ذرا بھی مبالغہ نہ ہو گا کہ ان کے ذریعہ جو کچھ حاصل ہوا اس کے نتیجہ میں ہم متعین مقصد کے ذرا بھی قریب نہ ہو سکے[21]۔

تجزیہ:

فاضل محقق کی آخری بات اس پورے پیراگراف کا نچوڑ ہے۔ کہ علوم کی اسلامائزیشن کے سلسلے میں جو بھی اقدامات ہوئے ہیں وہ بے کار نہ سہی لیکن ان کے ذریعے متعین مقاصد تک رسائی میں کوئی خاص پیشرفت بھی نہیں ہوئی۔ گویا جو کام ہوا ہے وہ بالکل اس طویل سفر کا پہلا قدم ہے جو اٹھایا گیا ہے۔

آگے ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی لکھتے ہیں۔

مولانا مودودی کو اس طرح کے کام کے نتیجہ پر اسلام کی عمومی مقبولیت اور بڑی تعداد میں اسلام سے متاثر ہونے کی جو امید تھی وہ پوری ہوتی نظر نہ آئی۔ الفاروقی کے منصوبہ پر اتنے وقت تک تو کام پورے جوش و خروش کے ساتھ ہوتا ہی رہا جو کسی نتیجہ تک پہنچنے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ لیکن کوئی ایسی نتیجہ خیز تحقیق سامنے نہ آ سکی جس کی امید کی گئی تھی۔ علوم کے اسلامیانے کی کوششیں معاشرتی و معاشی میدانوں اور سیاسی میدان میں اس نوع کی کوششوں کی طرح نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکیں اور تہذیبوں کے تصادم میں اسلام کی فتح کے قریب بھی نہ پہنچ سکیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی نہ کوئی اہم بات اس پورے عمل میں چھوٹ ہی گئی تھی جو مطلوبہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی[22]۔

تجزیہ: ڈاکٹر صاحب علوم کے اسلامیانے کے سلسلے میں مطلوبہ نتائج کی عدم دستیابی کا تذکرہ کرتے ہیں۔ کیونکہ جو امیدیں اور توقعات ان سے وابستہ کی گئی تھیں وہ سامنے نہیں آئیں۔ لیکن آگے فاضل محقق فرماتے ہیں کہ یہ تجزیہ کسی قسم کی ناامیدی اور دل شکستگی کو جائز قرار نہیں دیتا۔ مزید وقت دیا جائے تو بہتر نتائج کی توقع کی جا سکتی ہے۔ لیکن جوش میں کمی اور توجہ اور وسائل کے استعمال کی ترجیحات میں جو تبدیلی نظر آ رہی ہے وہ صاف طور پر عقل و تدبّر کے بجائے پر جوش اور جلد نتیجہ خیز فعالیت کی طرف زیادہ مائل ہے۔

تجزیہ: ان الفاظ کے ذریعے محقق ناامیدی سے قطع نظر اس سلسلے میں مزید کام کی ترغیب دے رہے ہیں۔ تاکہ ان علماء کی امیدیں پوری ہوں جنہوں نے اٹھارویں، انیسویں اور بیسویں صدی میں اسلامیت علوم کے ذریعے احیاء اسلام کا خواب دیکھا تھا۔

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی مزید لکھتے ہیں۔

تحریکات اسلامی بشمول اسلامائزیشن آف نالج کے حاملین مین ایک نئی صفت یہ در آئی ہے کہ ان کی نظر اب نتائج پر مرکوز ہوتی ہے طریقہ کار پر نہیں ہوتی۔ نتائج کو ترجیح دینے والوں میں قوت برداشت کم ہوتی ہے چنانچہ جب ان کے خواب پورے نہیں ہوتے تو وہ مخالف کے خلاف غم و غصہ کا اظہار کرتے ہیں اور ان میں مطلق العنانی در آتی ہے۔ صبر و تحمل کم ہوتا جاتا ہے اور قلیل مدّتی نتائج پر زیادہ توجہ ہوتی ہے۔ جبکہ طریق کار کو ترجیح دینے والوں کی نگاہیں طریق کار پر مرتکز ہوتی ہیں۔ ان میں جارحیت کم، صبر تحمل زیادہ اور دور تک دیکھنے کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے۔ اور کیونکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ پیش نظر تعمیر اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے اور ہمارا کام تو محض اس کے لئے محنت کرنا ہے اسلئے ان کے مزاج میں کسر نفسی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک اور بات یہ ہے کہ نتائج پرستوں میں برتری کا عنصر پایا جاتا ہے جبکہ طریق کار کو اہمیت دینے والے اپنے عزم میں زیادہ معتدل ہوتے اور اس طرح ایک تکثیری معاشرہ میں گھل مل کر رہنے کی صلاحیت سے معمور ہوتے ہیں[23]۔

تجزیہ:

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی ان سطور میں اسلامیت علوم کے علمبرداروں کی عدم کامیابی کی وجوہات پر روشنی ڈال رہے ہیں۔ ایک وجہ یہ ہے کہ یہ مختصر اور شارٹ کٹ نتائج چاہتے ہیں۔ جس کی بناء پر جب مطلوبہ نتیجہ حاصل نہیں ہو پاتا تو وہ دلبرداشتہ ہو جاتے ہیں۔ محقق کا یہ کہنا ہے کہ جو لوگ طریقہ کار پر توجہ دیتے ہیں وہ اس میں اپنی کمی کوتاہی پر توجہ دیتے ہوئے اس میں بہتری پیدا کر سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ صبر و تحمل سے کام لیتے ہیں۔ اور ان کی نظر صرف نتیجہ پر نہیں بلکہ اپنی کمی کوتاہی پر بھی ہوتی ہے۔ ایک اور وجہ یہ ہے کہ نتیجہ عموما انسان کے ہاتھ میں نہیں ہوتا بلکہ وہ مافوق الفطرت طاقت کے پاس ہوتا ہے۔ تو جو چیز آپ کے پاس نہ ہو اس پر دکھ درد اور افسوس کرنے کا چنداں فائدہ

نہیں۔اس کے بر عکس محنت اور طریقہ کار انسان کے بس میں ہوتا ہے،لہذا اس میں کمی بیشی پر توجہ دے کر وہ بہتری پیدا کر سکتے ہیں۔ آگے محقق فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کو دوسری اقوام کے ساتھ مابہ الاشتراک چیزیں ڈھونڈنی چاہئیں جو کہ بہت ساری ہیں۔جب وہ اس برابری کی سطح پر رہ کر کام کرنے کی کوشش کریں گے تو دوسری اقوام سے مدد بھی ملے گی۔

ڈاکٹر صاحب ایک اور مفروضہ ذکر کرتے ہیں۔

ایک دوسری غلط فہمی جو در حقیقت اس امید کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے کہ مستقبل ماضی ہی کی طرح ہو گا۔وہ یہ نُقطۂ نظر ہے کہ اس پوری دنیا کا ایک قائد ہو گا جو حالات کو درست سمت لے جائے گا اور نظم وضبط کو بحال رکھے گا۔ بہتری کی طرف دنیا کو گامزن کرے گا اور امن وامان قائم رکھے گا۔یہ محض ایک مفروضہ ہے۔حالات جس رخ پر جا رہے ہیں ان میں تو یہ لگتا ہے کہ اس دنیا میں کسی رہنما کو غلبہ نہ حاصل ہو سکے گا۔ماضی کے بزرگ صورتحال کے اس پہلو کو نہ سمجھ سکے یہ تو قابل معافی ہو سکتا ہے لیکن آج کی واضح صورتحال میں اس کو تسلیم نہ کرنا ناقابل معافی ہے۔امت کو کسی ایسے مقصد کے حصول کے لئے تیار کرنا اور اسے دعوت دینا کہ آنے والے دنوں میں جس کا کوئی امکان ہی نہ پایا جاتا ہو۔وقت کا ضیاع اور انتہائی نامناسب سی بات ہے۔اس مقصد کے حصول کو مسلمانوں کی ایک مذہبی ذمہ داری قرار دینا در اصل ان کے مذہب کو دھندلا اور مبہم کر دینے کے مترادف ہے۔

تجزیہ: محقق کی یہ بات کہ مستقبل میں کوئی ایک متعین رہنما نہیں آئے گا بلکہ اجتماعی دانشمندی کے ذریعے مسائل حل کئے جائیں گے۔موجودہ حالات کے پیش نظر اس بات میں کسی حد تک صداقت نظر آرہی ہے۔کیونکہ فیصلوں کے مراکز شخصیات سے نکل کر اب ادارے اور باہمی مشوروں کے ذرائع بن چکے ہیں۔واللہ اعلم بالصواب

نتائج تحقیق:

۱۔ علوم کے اسلامیانے کا عمل اسلامی اقدار اور اسلامی تہذیب کے کلی احیاء کیلئے ایک ناگزیر حقیقت ہے۔جس سے صرف نظر ناممکن ہے۔

۲۔ علوم کے اسلامیانے کا ایک اہم مقصد وحدتِ تعلیم کے تصور کو اجاگر کرنا ہے کیونکہ تعلیم کی ثنویت کا تصور اسلامی تعلیمات کے صریحاً خلاف ہے۔

۳۔ علوم کے اسلامیانے پر کام کرنے والے محقق کیلئے اسلامی علوم ومعارف کا گہرا اور وسیع مطالعہ ہونا ضروری ہے، اور اس کے ساتھ مغربی فکر وتہذیب کا وسیع اور گہرا مطالعہ رکھتا ہو تا کہ وہ اسلام اور مغربی فکر وتہذیب کا تقابلی مطالعہ کرنے کا اہل ہو۔

۴۔ نصاب سازی اور نصابی کتاب کی تدوین خود ایک فن ہے۔ جو اس شخص اس فن میں مہارت نہ رکھتا ہو وہ اس کام کا حق ادا نہیں کر سکتا۔

۵۔ دنیا میں جب بھی کسی قوم کو عروج ملا ہے وہ اس کی "مادی اشیاء" کا علم حاصل کرنے اور ان کے تسخیر سے ہی ملا ہے۔

۶۔ تصور خلافت اور اس کی اشاعت کیلئے علم کی توسیع انتہائی ضروری ہے۔ کیونکہ جس خلافت کو بنیاد بنا کر پوری دنیا میں اس کی اشاعت کی ذمہ داری لی گئی ہے اس کے منشور اور دستور کو بھی دنیا تک پہنچانا ضروری ہے۔

سفارشات:

۱۔ جدید علم کے ہر شعبہ سے اسلام کا خصوصی تعلق قائم کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔

۲۔ جدید علم اور اسلامی ورثہ کے تخلیقی امتزاج کی راہیں تلاش کرنا ایک اہم میدان ہے۔

۳۔ اسلامی فکر کو ایسے خطوط پر استوار کرنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے اصولوں کا انکشاف ممکن ہو سکے۔

---

[1].Al baqra- 59

[2].Al baqra- 146

[3].Muhammad, Najat ullah Siddiqi,ulum e islamia ki taskeel e jaded-tarjeehat kiya hon?bazm e urdu library,p 2

[4]. Ghazi ,Docter Mahmood Ahmad,Muhazarat e taleem(Organized by sayyed Aziz ur rahman),Zawar Academy,publicanions,karachi 2017,p 243

[5].Al muminoon,3

[6]. Ameen Muhammad, professor ,University of Lahore ,journal,,Altabyen vol3,p 132

[7].Doc, Ismail Raji Alfarooqi, uloom e jaded ki islami tashkeel,Translated BY professor Muhammad Saleem, published,idara taleemi wa tahqeeq,tanzeem e asatiza Pakistan,1989 .

[8].Neelam block,Iqbal town ,Lahore A/Publisher maktaba Alburhan,hamara taleemi buhran awr un ka hal,publisher,kitab mahal,dar bar market,lahore 97

[9] .http://marifaacademy.com/ur/discover/scholar Retrieved on 4/4/202۔.

[10]. Muhammad ,Najatullah ,Siddiqi,Uloom e islamia ki tashkeel e jaded,tarjeehat kiya hon? Bazme urdu library,p 14

[11] ۔ Islamization of Knowledge: General Principles and Work Plan. Ismail al-Faruqi, Virginia: International Institute of Islamic Thought, 1982.p 3

[12]. Muhammad ,Najatullah ,Siddiqi,Uloom e islamia ki tashkeel e jaded,tarjeehat kiya hon? Bazme urdu library,p 3

[13].Al Araaf 173

[14]. Muhammad ,Najatullah ,Siddiqi,Uloom e islamia ki tashkeel e jaded,tarjeehat kiya hon? Bazme urdu library,p 3

[15].Al anfal

[16].Ibrahim,33

[17]. Muhammad ,Najatullah ,Siddiqi,Uloom e islamia ki tashkeel e jaded,tarjeehat kiya hon? Bazme urdu library,p 5

[18].Muhammad ,Najatullah ,Siddiqi,Uloom e islamia ki tashkeel e jaded,tarjeehat kiya hon? Bazme urdu library,p 7

[19].Aal e Imran 33

[20].Al tawba 33

[21]. Muhammad ,Najatullah ,Siddiqi,Uloom e islamia ki tashkeel e jaded,tarjeehat kiya hon? Bazme urdu library,p 9

[22] ۔ Muhammad ,Najatullah ,Siddiqi,Uloom e islamia ki tashkeel e jaded,tarjeehat kiya hon? Bazme urdu library,p10

[23]. Muhammad ,Najatullah ,Siddiqi,Uloom e islamia ki tashkeel e jaded,tarjeehat kiya hon? Bazme urdu library,p 11